دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار

اور

ہندوستان کے لئے ان کا باعثِ افتخار ہونا

ایک تاریخی جائزہ، اور ان کے ساتھ سلوک و معاملہ کا ایک دیانتدارانہ محاسبہ

از

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

ناشر
شعبۂ نشر و اشاعت ندوۃ العلماء لکھنؤ

طبع اوّل

۱۴۱۵ھ — ۱۹۹۵ء

کتابت ——————— ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ——————— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

صفحات ——————— ۲۰

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

انچارج مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

طابع وناشر

شعبۂ نشر واشاعت ندوۃ العلماء۔ پوسٹ بکس ۹۳۔ لکھنؤ

(فیکس نمبر ندوۃ العلماء: ۳۸۰۵۷۰-۵۲۲-۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی و عربی مدارس کی خصوصیات اور ہندوستان کی تاریخ

اور

ثقافت (CULTURE) میں ان کا حصہ

فضلائے مدارس عربیہ کی چند امتیازی خصوصیات

قدیم دینی نظام تعلیم اور عام طور پر جو دینی یا عربی مدارس کہلاتے ہیں، وہ بعض ایسی خصوصیات کے مالک اور محافظ ہیں جو جدید تعلیمی نظاموں (EDUCATIONAL SYSTEMS) میں (ان کی افادیت اور ضرورت کا انکار کئے بغیر) مفقود یا بہت نایاب ہیں، اور ان کی بنا پر بدلے ہوئے زمانہ اور ترقی یافتہ جدید دور اور ایک نوخیز و ترقی پذیر معاشرہ میں ان کی قدر و قیمت اور ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہاں بہت اختصار کے ساتھ چند خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کی عملی مثالیں اور واقعات ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کے ہزارہا صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۔ ان میں سے ایک بڑا امتیاز و شعار (خصوصیت و علامت) پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا اخلاص (SINCERITY) اور ایثار (SACRIFICE) ہے، چونکہ تعلیم و تعلّم کا

اُخروی ثواب اور استاد و مُعلّم کی دینی فضیلت طلبہ کے ذہن پر نقش ہوتی ہے، اور ان کا عقیدہ اور جزوِ ایمان بن چکی ہوتی ہے، اس لئے ان میں (اگر سب نہیں تو ایک بڑی تعداد) محض خدا کی خوشنودی اور اجر و ثواب کے حاصل کرنے کے لئے تعلیم و تعلّم میں مشغول ہوتی ہے، اور اس کو افضل عبادت و اعلیٰ سعادت سمجھتی ہے، اساتذہ میں بہت سے حضرات زُہد و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اور اپنے علمی امتیاز اور کمالِ فن کی بنا پر اپنے ملک یا دوسرے ملکوں میں جو فوائد و مواقع حاصل کر سکتے ہیں، ان سے آنکھ بند کر کے اپنے ملک اور مدرسہ میں قناعت و ایثار کی زندگی گذارتے ہیں، اور اپنے فن اور طلبہ کی خدمت کرتے ہیں، کسی زمانہ میں بھی اقتصادیات اور معیارِ زندگی کتنی ہی اہمیت حاصل کر لے، اس ایثار و قربانی اور قناعت کی تحقیر اور اس کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔[1]

۲۔ دوسری خصوصیت درس میں انہماک ہے، مدارسِ عربیہ کے اساتذہ کو درس و تدریس میں اس درجہ استغراق و انہماک رہا کرتا تھا (اور اس کا نمونہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے) جس کا تصوّر بھی واقعات اور مثالوں کے بغیر مشکل ہے، اور ان کا اس مختصر مضمون میں پیش کرنا اور بھی دشوار تر ہے، پڑھنا اور پڑھانا، مطالعہ اور محنت ان کی روح کی غذا اور ان کی عبادت اور وظیفہ بن گیا تھا، اساتذہ کے تمام اوقات (بشری ضرورتوں اور قلیل راحت کے علاوہ) پڑھنے پڑھانے میں گھرے رہتے تھے، یہاں تک کہ بعض حضرات کھانے کے وقت اور چلتے پھرتے بھی پڑھاتے تھے۔

---

[1] اس ایثار و قناعت بلکہ قربانی کے چند واقعات اور مثالوں کے لئے مصنف کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" (تاریخی جائزہ) ملاحظہ ہو ص۱۱۸ ۔ ۱۲۰ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ۔ (اردو ۔ انگریزی اور ہندی ایڈیشن)

۳۔ تیسری خصوصیت طلبہ سے تعلق ہے، ان اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے ایسا گہرا اور شدید تعلق ہوتا تھا[1] جس کی مثال اس زمانہ اور جدید نظام تعلیم میں ملنی مشکل ہے، اساتذہ طلبہ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اکثر اوقات ان کے متکفل ہوتے تھے، اور ان کو خورد و نوش میں شریک کرتے تھے[2]۔

۴۔ اسی طرح طلبہ کا اساتذہ سے ایسا تعلق تھا، جس کے سلسلہ میں تاریخ و سوانح حیات میں ایسے واقعات ملتے ہیں، جن کا یقین کرنا اس زمانہ میں مشکل ہے اور جن کی نقل و تقلید بھی اس زمانہ میں دینی و علمی حیثیت سے نہ ضروری ہے نہ ممکن[3]، پھر بھی خالص مادّی اور لادینی (SECULAR) تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں اب بھی مدارسِ دینیہ عربیّہ کو اس سلسلہ میں کھلا امتیاز حاصل ہے۔

۵۔ ان دینی اور عربی مدارس کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اُن کے فضلاء اور سند یافتہ لوگوں نے اپنے وقت کے غلط رُجحان، کسی خطرناک فتنہ، یہاں تک کہ سلطنتوں (اور وہ عام طور پر مسلم سلطنتیں ہوتی تھیں) کی غلط سیاست اور ناجائز قوانین اور سرپرستیوں کا دلیرانہ اور بعض اوقات سرفروشانہ مقابلہ کیا، اور بعض اوقات اس میں جانیں دے دیں، اور بعض اوقات سلطنتوں اور ملک و معاشرہ کا رُخ بدل دیا، اور کسی قیمت پر بھی وہ حکومت کے ہاتھوں، یا اہلِ دولت اور اہلِ اثر کے ہاتھوں

---

[1] اور اب بھی مدارسِ عربیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

[2] اس کی عملی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۲-۱۲۳

[3] ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۲۳-۱۲۴

سکے نہیں۔[1]

٦۔ اس تعلیم و تربیت، حق پسندی، اخلاقی جرأت اور ضمیر کی آزادی و بیداری کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے مقابلہ کی پہلی صدا اسی دینی طبقہ اور علماء کے حلقہ سے بلند ہوئی، اس نے سب سے پہلے اس خطرہ کو محسوس کیا اور انگریزی اقتدار کے خلاف جدّوجہد کا آغاز کیا[2]، انگریز مؤرخین نے صاف طور پر اس کا اظہار کیا ہے کہ "۵۷ء کی جنگ آزادی میں (جس کو وہ غدر (MUTINY) کے لقب سے یاد کرتے ہیں) سید احمد صاحبؒ کی جماعت مجاہدین کی چنگاریاں ہی کام کر رہی تھیں، اسی بنا پر اس جنگ آزادی میں سب سے بڑی قربانیاں اسی جماعت کے افراد و خاندانوں، بالخصوص خاندان صادق پور پٹنہ نے دیں، ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں، مکانات یہاں تک کہ مقابر تک منہدم کئے گئے، اور بعض نامی گرامی افراد (مولانا یحیٰی علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب) جزیرۂ انڈمان اور کالا پانی بھیج

---

[1] اس کی دستاویز روشن ترمثالوں کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصۂ چہارم و حصۂ پنجم، اور اس کا انگریزی ترجمہ

(SAVIOURS OF ISLAMIC SPIRIT) (Vols. III & IV)

[2] ملاحظہ ہو حضرت سید احمد شہیدؒ متوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء کا خط مہاراجہ گوالیار اور ان کے افسر افواج کے نام جس میں انھوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف متحدہ جنگ اور صف آرائی کی دعوت دی ہے (سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول ص ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۴) انھوں نے نواب امیر خاں (بعد میں والیٔ ریاست ٹونک) کی رفاقت ترک کر دی، جب انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کر لی، (سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول ص ۱۴۶۔ ۱۴۷)

دیئے گئے، اور وہیں اول الذکر دونوں افراد کی وفات ہوئی[1]۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی آزادی کا صور پھونکا گیا، اور آزادی کی تحریک اور تحریک خلافت وجود میں آئی تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ قربانیاں طبقۂ علماء کے افراد اور فضلائے مدارس نے دیں، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی (جو شیخ الہند کے لقب سے معروف ہیں) اور ان کے ساتھ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عزیر گل صاحب، مولوی وحید احمد، اور حکیم نصرت حسین کوڑوی کو ۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (۲ا جنوری ۱۹۱۷ء) کو پہلے مصر پھر مالٹا بھیج دیا گیا، جہاں وہ تین سال دو مہینے رہے، اور حکیم نصرت حسین صاحب کا وہیں انتقال ہوا، واپسی پر بھی وہ آخر وقت تک آزادی کی جدّوجہد، اور اس تحریک و دعوت میں نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش رہے، جہاں تک مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا تعلق ہے، وہ اتنے بار جیل گئے کہ کسی سیاسی قائد کو اس کا اتفاق کم ہی ہوا ہوگا۔

اس تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند اور ان کے اہلِ عقیدت و ارادت کے علاوہ کثیر التعداد علماء اور فضلائے مدارس شریک تھے، جن میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "کالا پانی" (از مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری) ان حضرات کے علاوہ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی اور مفتی مظہر کریم صاحب دریابادی کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی، اور یہ سب تعلیمی حلقہ اور مدارس کے لوگ تھے، ملاحظہ ہو تذکرۂ صادقہ (تالیف مولانا عبد الرحیم صاحب صادقپوری، و مقدمہ از مولانا ابو الکلام آزاد)

فرنگی محلی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبد الحلیم صدیقی، اور کثیر التعداد علماء اس گروہ میں شامل ہیں مولانا ابو الکلام آزاد معروفِ عوام و خواص ہیں، اور وہ نہ صرف جنگ آزادی کے ایک قائد و رہنما، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ دماغ اور مفکرِ اعظم ہیں، ان کے علاوہ بھی عام طور پر فضلائے مدارس، علمائے دین، یہاں تک کہ خالص علمی و تحقیقی کام کرنے والے حضرات بھی تحریکِ آزادی وطن سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والے اور فکری طور پر ان سے ہم آہنگ تھے، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی (ناظم دار المصنفین) مولانا معین الدین اجمیری اور مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب بہاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اور ہندوستان کی تاریخ آزادی کا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ان فضلاء و طلبائے مدارس عربیہ کی ایک خصوصیت (جس کو اس صدی کے اخلاقی طور پر بر بسرِ انحطاط معاشرہ اور بے اصولی کے دور میں بے قیمت اور حقیر نہیں سمجھا جا سکتا) اُن کے ان اخلاقی اصول، دینی تعلیمات، اور تہذیب و آداب کی پابندی ہے جو وہ قرآن و حدیث، سیرت نبویؐ، اور علمائے سلف کے تذکروں سے سیکھتے، اپنے اساتذہ میں اس کا نمونہ دیکھتے اور ان سے اس کی تاکید و تعلیم پاتے ہیں، اور جس کی اس بگڑے ہوئے (CORRUPT) معاشرہ میں بڑی ضرورت ہے، اور جس کو کردار سازی (CHARACTER BUILDING) سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس کی ہمارے معاشرہ میں عام طور پر اور جدید دانش گاہوں میں خاص طور پر کمی نظر آتی ہے۔

مشہور و ممتاز ترین دینی و علمی درسگاہیں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر ملک میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ احساسِ شکست، احساسِ کہتری، اور ایک عام مایوسی پھیلتی جا رہی تھی، نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ پورے ملک میں جدید مغربی نظام تعلیم اور فلسفۂ زندگی و تمدن کا اثر بلکہ سحر پھیلتا جا رہا تھا، اور اس سے اخلاق و معاشرت میں ایک انتشار اور سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی غلامی پیدا ہو رہی تھی، جس کا اثر اخلاق و معاشرت پر بھی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا[1] اور آسانی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اگر یہی صورتِ حال باقی رہی تو ہندوستان کی آبادی بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ (جس کے ہاتھ میں زمامِ قیادت اور عنانِ فکر رہتی ہے) اس مغربی قارورہ میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔

اس تاثر کا مقابلہ کرنے کے لئے یونیورسٹیاں کافی نہیں تھیں، جو مغربی نظامِ تعلیم ہی کی مقلد، خوشہ چیں بلکہ پیرو تھیں۔

اس صورتِ حال کے مقابلہ میں جری اور دور بیں علماء نے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد (کم سے کم) مسلمانوں کو دینی و اخلاقی

---

[1] اس کا مقابلہ سب سے زیادہ مشہور و نامور شاعر لسان العصر سید اکبر حسین الہ آبادی اکبر نے کیا، جو مغربی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور پورے مشرق میں اس پر سب سے بڑے صاحبِ نظر اور طنز نگار تھے، مصر میں بھی ان کا تعارف (راقم کے قلم سے) اور ان کے کلام کے ترجمہ پر ایک کتاب الحضارة الغربية الوافدة واثرها في الجيل المثقف کے نام سے دار الصحوة القاهرة کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

زوال سے محفوظ رکھیں، اور ان میں داعیانہ روح اور رضاکارانہ خدمت اور اشاعتِ علم کا جذبہ ہو، اور جو حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کی دینی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت و حفاظت کا فرض انجام دے سکیں۔

دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مرکزی دینی مدارس

ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو اوّلیت اور خاص اہمیت حاصل ہے، دارالعلوم دیوبند سے اس کی سَو سالہ تاریخ میں تحصیل علم کر کے نکلنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے، فارغین میں افغانستان، یاغستان، خیوہ، بخارا، قازان، روس، آذربائیجان، مغرب اقصیٰ، ایشیائے کوچک، تبت، چین، جزائر بحر الہند وغیرہ دوسرے ملکوں کے طلبہ شامل ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے، متعدد فضلاء نے سیاسی میدان اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور حق گوئی و بے باکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کر دی۔

دارالعلوم دیوبند کے بعد سہارن پور کے مدرسہ مظاہر علوم کا نمبر ہے یہاں سے بھی بڑی تعداد میں علماء اور علم دین کے مخلص و خدمت گذار فارغ ہو کر نکلے ہیں، جنھوں نے خاص طور پر فنِ حدیث کی بڑی خدمت کی ہے متعدد کتب حدیث کی شرحیں ان کے قلم سے نکلی ہیں، جن کی وجہ سے ممالک عربیہ میں بھی اس کی شہرت

ہوئی ہے، اور وہاں کے ماہرینِ فن بھی ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں[1]۔

ہندوستان میں درسِ نظامی کے دوسرے مدارس بھی ہیں، جن میں قدیم نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، جماعت اہلِ حدیث کے بھی متعدد مدارس ہیں، جو حدیث وسنّت کی تدریس وتحقیق کا کام کرتے ہیں، فرقہ اثنا عشری (شیعہ فرقہ) کے بھی مدارس ہیں، جن میں لکھنؤ کے بعض مدارس (سلطان المدارس، ناظمیہ و مدرسۃ الواعظین) ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جنوبی ہند میں بھی کثیر التعداد وسیع وعظیم درسگاہیں ہیں، یو۔پی، بہار گجرات، دکن (خاص طور پر حیدر آباد) کرناٹک اور مالابار کیرالا میں متعدد شاندار مدارس اور دینی وعلمی ادارے ہیں[2]۔

دار العلوم ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی فکری تحریک ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں وجود میں آئی، اس کے بانی مولانا سید محمد علی مونگیریؒ تھے[3]، اس کی رہنمائی ان کے بعد عرصہ تک علامہ شبلی،

---

[1] ان میں خاص طور پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی (متوفی ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) قابلِ ذکر ہیں، جن کی شروح حدیث اور علمی رسائل مصر، شام، و حجاز میں بڑی وقعت اور عقیدت سے پڑھے جاتے ہیں، اور ان کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا جاتا ہے۔

[2] اس کے لئے ان مدارس عربیہ کی مکمل فہرست پیش کرنی مشکل ہے، بطور نمونہ ملاحظہ ہو مصنّف کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" ص ۱۳۴-۱۳۶

[3] مولانا کے حالات وسوانح کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" از سید محمد الحسنیؒ شائع کردہ ندوۃ العلماء۔ (باقی ص ۱۲ پر)

اُن کے نامور رفقاء وتلامذہ خاص طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ہندوستان کے ممتاز علماء اور اہلِ فکر ونظر تنے کی جو نظامت اور معتمدی کے منصب پر فائز رہے۔[لہ]

اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ اور اصول پر تھی کہ نصابِ تعلیم ایک تغیر وترقی پذیر ذریعۂ تعلیم وتربیت ہے، جس کو زمانہ کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (دینی روح ومقاصد، بنیادی عقائد، اور اساسی علوم کی حفاظت کے ساتھ) بدلتے اور ترقی کرتے رہنا چاہیئے، وہ ان کے نزدیک ایک جامد، متحجّر (FOSSILIZED) نصاب ہونے کے بجائے ایک زندہ اور نامی جسم کی طرح زندگی، ترقی، اور وسعت کی صلاحیتوں سے بھرپور ہے، دوسرے الفاظ میں دین ایک ابدی حقیقت ہے، جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے، جس کا نشوونما برابر جاری رہے گا، اسلام ان کے نزدیک ایک عالمگیر اور جاوداں دین اور زندگی ہے، اس لئے ذہن انسانی کے ارتقاء وتنزّل، اور تغیّرات کی مختلف منزلوں سے اس کا سابقہ پڑنا، اور ان بدلے ہوئے حالات وتصوّرات وافکار میں رہنمائی کا فرض انجام دینا، اور پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو رفع کرنا ایک قدرتی امر ہے، اس کے لئے اس ذریعۂ تعلیم کی بھی (جو اسلام کے نمائندوں اور اس کے شارحین کو تیار کرتا ہے) اپنے دائرہ کو برابر وسیع کرتے رہنے

(باقی صہ ۱۱ کا) منصب نظامت کے ذمہ داروں میں ہندوستان کے نامور مصنف، مؤرخ وادیب اور عربی میں ہندوستان کی تاریخ اور شخصیات کے سب سے بڑے مؤرخ اور سوانح نگار مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ اور ان کے فرزند گرامی قدر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کا ذکر کافی ہوگا، جو ایک طرف علماء راسخین میں تھے، دوسری طرف علومِ جدیدہ کے ماہرین اور ممتاز فضلاء میں تھے۔

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ندوۃ العلماء" (۱-۲) شائع کردہ دفتر نظامت ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اور اپنی صلاحیت و زندگی کا ثبوت دیتے رہنے کی ضرورت ہے۔

اس احساس اور حقیقت بینی کی بنا پر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور رہنماؤں نے ان یونانی علوم (منطق و فلسفہ) کے اس حصّہ کو کم اور بقدر ضرورت رکھا اور اس علم کلام میں بھی حذف و اضافہ سے کام لیا، جو درحقیقت یونان کے ان مفروضات اور تعلیمات کی تردید پر مبنی تھا، جو علمی حقائق کے بجائے یونان کی دیومالا (GREEK MYTHOLOGY) پر مبنی تھا، اس کے بجائے جدید علوم میں سے جغرافیہ، تاریخ، ریاضی اور جدید کتابوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے انگریزی کی محدود تعلیم داخل نصاب کی محض کتب تفسیر پر اکتفا کرنے کے بجائے متنِ قرآن کو داخل نصاب کیا۔

ایک بڑا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ عربی زبان کو (جس کی قدیم نصاب میں نمائندہ اور ذریعۂ تعلیم نثر و نظم کے چند مجموعے تھے، جو تصنّع و تکلّفات سے مملوء اور محض مشکل الفاظ کے سمجھنے اور یاد کرنے کا ذریعہ تھے) ایک زندہ و رواں، تقریر و تحریر، اور دعوت و تاثیر کی قابلیت پیدا کرنے والی زبان کی طرح تعلیم دینے کا انتظام کیا، جس سے وہ افراد تیار ہو سکیں، جو خود اہلِ زبان کو متاثر کرنے اور عالم عربی کے (عصر جدید اور مغربی اقتدار سے پیدا ہونے والے فتنوں اور تحریکات) کا مقابلہ کرنے اور دینِ حنیف کی دعوت دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں، چنانچہ اس کے متعدد فضلاء نے قومیتِ عربیہ کی زبردست تحریک، جس کے بانی عیسائی عرب تھے، اور جس کا مقصد عربوں کو جاہلیتِ اولیٰ کی طرف واپس لانا تھا جس میں کفر و ایمان، اسلام اور عیسائیت کا کوئی فرق نہیں تھا، اور جس کی طاقتور داعی "البعث العربی"

کی تحریک' اور جس کے بڑے حامی و سرپرست ماضی قریب میں صدر جمہوریۂ مصر جمال عبدالناصر، انورالسادات اور شام کی بعث پارٹی تھی، طاقتور اور نہایت مؤثر مقابلہ کیا، جس کا اعتراف اسلامی الفکر عرب فضلاء اور قائدین نے کیا۔[۱]

ندوۃ العلماء کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درسگاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت سیرت نبوی کی تحریر و تدوین' اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اُسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا، علامہ شبلی نعمانی کی علمی و ادبی تحریرات' اسی طرح ان کے شاگرد رشید و جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا' مؤقر اور عالمی شہرت رکھنے والے ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ، اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور اہلِ فکر کو متأثر کرنے والا ایسا اسلامی لٹریچر تیار کیا جس کی مثال بہت سے خالص اسلامی اور عرب ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔[۲]

اس کے نصاب کے لئے تیار کی ہوئی بعض کتابیں خالص عرب ملکوں کے اسکولوں'

---

[۱] اس کا نمونہ جواں سال ادیب و انشاء پرداز سید محمد الحسنی مرحوم کی تحریریں، اور "البعث" اور "الرائد" کے پرچے ہیں' جن کے مضامین سے خود قومیت عربیہ کے داعی مضطرب اور پریشان ہوئے' اور صاحبِ حمیّت و انصاف عرب فضلاء نے ان کی طاقت و بلاغت کا اعتراف کیا۔

[۲] مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی متعدد کتابوں کا ترجمہ ترکی، فارسی، انڈونیشی، فرنچ، جرمن، روسی اور اب حال میں اسپینی زبان میں بھی شروع ہو گئے، اس کی بعض کتابوں کے (جس کے اردو میں چار پانچ ایڈیشن نکلے ہوں گے) عرب ملکوں میں ۱۵۔۱۵ اور ۲۰۔۲۰ ایڈیشن نکلے۔

کالجوں اور بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں، جو نہ صرف دار العلوم ندوۃ العلماء
یہاں کے مدارسِ عربیہ، بلکہ ہندوستان کے لئے ایک فخر کی بات ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی ان خصوصیات اور کارگذاریوں سے خود ہندوستان کا عالم اسلامی اور ممالک عربیہ میں اچھا تعارف ہوا، اس کے کارناموں کا اعتراف کیا گیا، اور اس کے فضلاء کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم (ڈاکٹر سر محمد اقبال) نے اپنی بالغ نظری سے اس حقیقت کو دیکھا اور اس کا اعتراف کیا، وہ لکھتے ہیں:-

"میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کامیاب ثابت ہو"[1]

خود ممتاز ترین فضلائے عرب نے بھی وقتاً فوقتاً اس کے امتیاز کا اعتراف کیا، یہاں پر چند تأثرات و بیانات درج کئے جاتے ہیں۔

علامہ عبدالعزیز تیونسی جو اپنے ملک کے بڑے سیاسی رہنما، عربی کے بڑے فاضل و ادیب تھے ۱۹۲۳ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے دار العلوم میں اپنی تقریر میں کہا:-

"حضرات! عالم اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، اگر آپ اپنی تنظیم کر لیں، تو تمام عالم اسلامی کی بہبودی اور ترقی کا کام کر کے آپ بن سکتے ہیں، پھر آپ اپنی طاقت سے ایک بار دنیا کا نقشہ پلٹ سکتے ہیں"[2]

عالمی شہرت اور اہمیت کے مالک شیخ الازہر الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے بھی

---

[1] "اقبال نامہ" ص ۱۶۸، کتاب موسوم "اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں" میں "اسلامی ہند" کے بجائے "اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں" کے لفظ آئے ہیں ص ۱۸۸ [2] "تاریخ ندوۃ العلماء" حصہ دوم ص ۲۸

اس کا اعتراف و اظہار اپنے اس خطبۂ صدارت میں کیا جو ندوۃ العلماء کے پچاسی ۸۵ سالہ جشن منعقدہ ۱۹۷۵ء (۳۱ر اکتوبر۔ ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء) کے موقعہ پر پڑھا :-

"آج پورا عالم اسلام ندوہ کی قابلِ تحسین و آفریں مساعی کا احساس رکھتا ہے، اور نشر و اشاعت کی ان کوششوں اور خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو یہاں انجام دی جا رہی ہیں، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے جو غور و فکر میں مشغول ہیں، اور راہِ خدا میں ہر طرح کی کوشش کر رہے ہیں"[1]

پچاسی ۸۵ سالہ جشن کے حوالہ سے اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ علمی و بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کی قریبی پچھلی تاریخ میں کسی اجلاس میں بیرونی دنیا کے اتنے فضلاء، خاص طور پر عالمِ اسلام کے اتنے ممتاز علماء، اہلِ فکر و نظر، خطباء اور ذمہ دارانِ مدارس و جامعات ہمارے علم میں ہندوستان نہیں آئے، صرف بیرونی مندوبین کی تعداد (جس میں عرب ممالک کے علاوہ روس و ایران کے مندوب بھی تھے) ۷۱ تھی، یہ یاد رہے کہ یہ جشن اس وقت ہوا جب ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ تھی۔

ندوۃ العلماء کو عالم عربی میں جس نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے ہندوستان کا جو وقار و احترام ہے، اس کے سمجھنے کے لئے عصر حاضر کے ممتاز ترین عرب ادیب و انشاء پرداز علامہ شیخ علی الطنطاوی (سابق جج اپیلنگ کورٹ دمشق، پروفیسر بغداد یونیورسٹی، حال مقیم حجاز) کا یہ تأثر کفایت کرتا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ندوہ ایک معتدل اور جامع راستہ پر چلنے والا ادارہ ہے، یہ راستہ نہ اپنی منزل سے منحرف ہوا ہے اور نہ اس نے اس مستقیم راستہ کو چھوڑا ہے، یہ قدیم مدارس جامع ازہر وغیرہ

---

[1] ملاحظہ ہو "رودادِ چمن" ص ۱۲۵

اور جدید جامعات (یونیورسٹیوں) کے درمیان ایک معتدل اور جامع راستہ ہے، جس میں نہ قدیم مدارس کا جمود ہے، نہ جدید جامعات کی جدّت پسندی، اس نے ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کیا ہے، اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔

میں ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دے رہا تھا، مجھ سے ٹیلی ویژن کے نمائندہ نے سوال کیا کہ وہ کونسا مقام ہے جس میں آپ اپنی زندگی کے بقیہ ایام صرف کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں اگر اپنے شہر (دمشق) کو واپس نہ ہو سکا، اور یہاں بیت اللہ کے جوار میں بھی رہنا نصیب نہ ہوا[1] تو میں لکھنؤ کو ترجیح دوں گا، اور یہ کہ میں ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں قیام کروں، جو ایک پُر فضا محل و مقام بھی ہے، اور وہاں علماء کی صحبت بھی میسّر ہے[2]۔"

ہندوستان کے فخر و مسرّت کے لئے یہ بات بھی کافی ہے کہ یہاں کی ایک تعلیم گاہ اور عربی درسگاہ (دار العلوم ندوۃ العلماء) کی تالیف کردہ عربی زبان و ادب کی کتابیں ترقی یافتہ عرب ممالک کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں داخلِ نصاب ہیں، اور یہاں کے بعض فضلاء، عالمی (INTERNATIONAL) اسلامی و عربی ادب کی تنظیمات اور انجمنوں کے صدر و سکریٹری ہیں[3]۔

تحریک "پیامِ انسانیت"

"پیامِ انسانیت" کی تحریک جو وقت کا اہم ترین تقاضہ اور ملک کو (جو وطن و مسکن بھی تھا،

---

[1] علامہ طنطاوی دمشق چھوڑنے کے بعد جو سیاسی وجوہ سے تھا، مکہ معظمہ ہی میں مقیم ہیں۔

[2] مقدمہ کتاب "فی مسیرۃ الحیاۃ" ص ۱۳ [3] جیسے رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ اور (CENTRE OF ISLAMIC STUDIES,OXFORD UNIVERSITY)

اور ایک بلند مرتبہ تہذیب' انسان دوستی' اور روحانی و اخلاقی دعوتوں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا تھا) "خودکشی" اور غیبی سزاؤں کا مستحق بننے سے بچانے کا ایک کامیاب اور مؤثر ذریعہ بھی تھا، جس کے بغیر اس ملک میں نہ امن و امان اور اعتدال کی زندگی گذاری جاسکتی تھی، نہ کوئی تعمیری' اصلاحی' علمی و دعوتی کام سکون سے کیا جاسکتا تھا، فرقہ وارانہ منافرت' دولت کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس' جان و مال' عزت و آبرو کی بے قیمتی، مذہبی و اخلاقی تعلیم کے فقدان' اور پریس اور ذرائع ابلاغ کی اشتعال انگیزی نے اس ملک کو ایک میدانِ جنگ میں تبدیل کردیا تھا، جس میں کسی وقت بھی باہمی جنگ کے شعلے بھڑک سکتے تھے' اور کمزوروں' یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں پر بے رحمانہ طریقہ پر ہاتھ اٹھایا جاسکتا تھا، اور اٹھایا جاتا تھا، ضرورت تھی اور وقت کا اہم ترین تقاضہ تھا کہ کسی بڑی اصلاحی یا سیاسی تنظیم، یا روحانی و تعلیمی مرکز سے انسانیت کے احترام، جان و عزت و آبرو کی قیمت شناسی' اور محبت و شرافت' قدر و اعتراف اور حفاظت باہمی کے ساتھ زندگی گذارنے اور ملک کا نام روشن کرنے کی تحریک شروع ہو، جس سے یہ ملک نہ صرف اپنی حفاظت' نیک نامی بلکہ دنیا اور متحارب ملکوں کو امن و مصالحتِ باہمی کا پیام دے سکے اور عالمی سطح پر ایک بلند کردار ادا کرسکے۔

لیکن مدّت دراز سے اور تقریباً تقسیم ملک کے بعد سے اس بارے میں ہر طرف خاموشی تھی، اور اس کوشش یا احساس نے کسی تحریک اور دعوت کی شکل نہیں اختیار کی تھی، جس میں مذہبی جذبہ، خدا کی رضاجوئی کی طاقت و برکت بھی شامل ہو، اور انسانی جان اور عزت و آبرو کی قدر شناسی' اور سچی حبّ الوطنی کا جوہر بھی۔

توفیق الٰہی اور علم دین (جو احساس ذمہ داری اور خدا کے سامنے جوابدہی کا

خوف پیدا کرتا ہے) کی کرشمہ سازی تھی کہ یہ تحریک ایک ایسے ادارہ سے شروع ہوئی جس کا کام پڑھنا پڑھانا، علمی، ادبی اور تحقیقی کام انجام دینا اور اپنے دینی بھائیوں کو نصیحت کرنا اور تعلیم دینا تھا۔ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے چند افراد نے ۱۹۷۴ء میں "تحریک پیام انسانیت" کے نام سے ایک تحریک اور جدوجہد کا آغاز کیا، اس سے کچھ پہلے ہی جمشید پور، راؤرکیلا اور رانچی میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس کے علاوہ بھی جابجا نسل کشی اور برادر دشمنی کے واقعات پیش آرہے تھے، رشوت کا بازار گرم تھا، روزمرہ کی زندگی بھی غیر محفوظ ہوتی چلی جارہی تھی، ندوۃ العلماء کے چند ذمہ داروں اور وہاں کے فضلاء نے "پیام انسانیت" کے نام سے یہ کام شروع کیا، ملک کے دورے کئے اور ہندوستان کے تقریباً تمام اہم اور مرکزی مقامات میں جلسے کئے جن میں اس خیال اور تحریک کے ترجمان مسلمان مقررین کے علاوہ اکثریت کے فرقہ کے دانشور اور ہمدرد انسانیت بھی شریک ہوئے اور مؤثر تقریریں کیں، اور نہ صرف ان مقامات پر بلکہ دور دور ان کا اچھا ردعمل اور تأثر ہوا، اب بھی یہ تحریک اس نام سے چل رہی ہے اور اس میں کی ہوئی تقریروں اور پڑھے ہوئے مقالات کا ایک بڑا ذخیرہ اردو، ہندی، انگریزی اور بعض علاقائی زبانوں میں شائع ہوچکا ہے۔[۱]

ایک افسوسناک حادثہ اور ملک کے لئے باعث شرمندگی واقعہ

لیکن آخر میں بڑی شرمندگی اور قلق کے ساتھ لکھا جارہا ہے کہ ۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں اس عالمی شہرت و اعزاز کے ادارہ اور مرکز میں نصف شب (۲ بجے رات) کو ذمہ داروں کے علم و اطلاع کے بغیر (جو وہاں موجود تھے) مرکزی پولیس اور انٹلی جنس بیورو (آئی۔بی)

---

[۱] یہ رسائل و مقالات "دفتر پیام انسانیت" دارالعلوم ندوۃ العلماء، یا "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے طلب کئے جاسکتے ہیں، پونہ سے بھی اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی گئی ہے، انیس چشتی صاحب ۲۵۴ کیداری روڈ۔ پونہ ۴۱۱۰۰۱ سے یہ لٹریچر مل سکتا ہے۔

[۲] حاشیہ صفحہ ۲ پر ملاحظہ ہو۔

کے ایک سیکشن نے ریاستی پولیس کے چند افراد کو ساتھ لے کر (جو یو، پی کی حکومت کے ذمہ داروں کی اطلاع کے بغیر شامل ہو گئے تھے) زبردستی دار العلوم کے احاطہ میں داخل ہو کر چھاپہ مارا، ان کو ایک ایسے طالب علم کی تلاش تھی جس کے کسی کاغذ پر اطہر ہوسٹل دار العلوم ندوۃ العلماء کا نام لکھا تھا محض اس خیال سے کہ ایسا کوئی شخص وہاں ہوگا مسلح چھاپہ مارا، وہاں اس کا کوئی نشان نہیں ملا اور کچھ ثابت نہیں ہوا تو انھوں نے ہوسٹل کی تلاشی لی، اور وہاں گولیوں کے کئی ہوائی فائر کئے جن سے دو[2] طالب علم زخمی ہوئے سات طالب علموں کو ان کے شبانہ لباس میں موسم سرما کی سرد رات میں پکڑ کر لے گئے لیکن ان سے کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی، نہ ان کا کسی تشدد پسند مخالف حکومت تنظیم سے تعلق نکلا، پھر ریاستی حکومت کے ذمہ داروں (بالخصوص وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ جی یادو کی مداخلت اور حکم سے) وہ چھوڑ دیئے گئے، اور یہ تفتیشی اقدام بالکل بے نتیجہ اور ناکام ثابت ہوا، افسوس ہے کہ اس اقدام کی وجہ سے جو ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے، اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے والے عالمی ادارہ میں پیش آیا تھا، ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر ملک بدنام ہوا اور ایسا احتجاج کیا گیا جس کی مثال اہم حوادث پر بھی سالہا سال سے نہیں ملتی ہے، ممالک عربیہ کے متعدد ذمہ داروں نے بھی اس پر احتجاج کیا، کثرت سے احتجاجی خطوط، فیکس اور تار آئے، اور ٹیلیفون کے پیغامات کی تو کوئی گنتی نہیں۔

خدا کرے ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت ان اقدامات میں احتیاط اور دور اندیشی سے کام لے، تعلیم گاہوں، بالخصوص ان مدارس دینیہ و عربیہ کا احترام اور ان کی قدر کرے، جن کی خصوصیات، خدمات، قربانیوں اور کارناموں کا ذکر تفصیل سے اس مختصر رسالہ میں کیا گیا ہے اور جو ملک کا ایک بیش قیمت سرمایہ، نسل جدید کی ایک اہم ضرورت اور بیرونی دنیا میں ہندوستان کے لئے سرمایۂ عزت و افتخار ہے، بلکہ قابلِ رشک اور حیرت آور اور لائق تقلید اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۹ کا)

[2] جن میں دار العلوم کے مہتمم مولوی سید محمد رابع ندوی، نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور معتمد تعلیم ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی اور اقامت گاہوں کے متعدد نگران حضرات شامل ہیں۔